بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ایک طویل مدت کے بعد ان صفحات میں پھر اظہارِ خیال کا موقع مل رہا ہے۔ اس مدت میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت و ربوبیت کے جو تجربات ہوئے وہ اس سے بہت زیادہ ہیں کہ یہ بندۂ عاجز ان کے شکر کا حق ادا کر سکے، اور اس بندے کے گناہ اس سے بدرجہا زیادہ ہیں کہ یہ اپنے آپ کو مالک کی ان عنایات کا کسی درجے میں بھی مستحق سمجھے۔ دعا ہے کہ جس آقا نے اتنا کچھ فضل و کرم فرمایا ہے وہی اپنے بندے کو اتنی توفیق بھی بخشے کہ وہ مستقبل میں اپنے ماضی کے قصوروں کی تلافی کر سکے اور دینِ حق کی کوئی ایسی خدمت بجا لائے جو آخرت میں قبولیت سے نوازی جانے کے لائق ہو۔ اپنے مخلص احباب اور تمام خیر خواہوں سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے حق میں اسی چیز کی دعا فرمائیں۔

میری ناچیز خدمات کو جو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں انہیں فطرۃً میری خلاف توقع واپسی پر غیر معمولی مسرت ہوئی ہے۔ ان کی طرف سے اس مسرت کا اظہار جس خلوص و محبت کے ساتھ کیا گیا اس کے لیے میں اُن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجرِ جزیل عطا فرمائے گا، کیونکہ میرے ساتھ ان کی یہ محبت کسی ذاتی تعلق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض اللہ اور اس کے دین کی خاطر ہے۔ کاش میرا مولیٰ مجھے فی الواقع اُس حسنِ ظن کا مستحق بنا دے جو اس کے بہت سے بندے مجھ سے رکھتے ہیں، اور مجھ کو اُن نیک توقعات کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو دینِ حق کی صحیح خدمت کے لیے انہوں نے مجھ سے وابستہ کی ہیں۔

اس کے ساتھ میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دوستوں کے اظہارِ مسرت اور جذبۂ محبت و قدر افزائی نے بعض مواقع پر کچھ ایسی شکلیں اختیار کی ہیں جن میں اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ میرے لیے ان کو روکنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ زہد و انکسار کی نمائش مجھے پسند نہیں ہے، اور ان کو گوارا کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ

میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ چیزیں اپنے اندر فتنہ بننے کی اچھی خاصی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میرے دوست کم از کم میرے متعلق اپنے جذبات کے اظہار میں حدِ اعتدال سے بھی کچھ کم ہی پر اکتفا کیا کریں۔

میری غیر حاضری کا زمانہ اگرچہ بکثرت حوادث سے لبریز گذرا ہے، لیکن دو حادثے خصوصیت کے ساتھ ایسے تھے جنہوں نے مجھے سخت متاثر کیا۔

ان میں سے پہلا حادثہ مولانا مسعود عالم ندوی کی وفات کا ہے جس کا نقصان کچھ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ان کے اوصاف اور کاموں سے واقف ہیں۔ وہ اس ملک کے اُن چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن کو عربی ادب و انشا میں ایک بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ اپنی اس قابلیت سے کام لے کر انہوں نے برِ عظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں اور عربی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان سفارت کے وہ فرائض انجام دیے جو شاید اس دور کے کسی دوسرے شخص نے کم از کم اس حد تک انجام نہیں دیئے۔ عرب ممالک کو یہاں کے حالات اور مسائل اور تحریکوں سے روشناس کرانے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس خدمت کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں معلوم ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں کے درمیان براہِ راست ذرائع معلومات کا نہ ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو جاننے کے لیے محض فرنگی وسائلِ اطلاعات پر انحصار کرنا کتنا نقصان دہ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی وفات درحقیقت ایک قومی نقصان ہے جس کی تلافی کرنے والے کم ہی نظر آتے ہیں۔

جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والوں نے ان کے فقدان کو خاص طور پر شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے، کیونکہ انہیں مرحوم کی خوبیوں اور خدمات سے براہِ راست سابقہ پیش آیا ہے۔ وہ ایک ایسے حلقے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اکابر جماعت اسلامی کو پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری طرف، جماعت اسلامی کی بنا جن لوگوں نے ڈالی تھی اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی مرحوم کے شخصی مراسم نہ تھے بلکہ مجموعیت، اکثر سے ان کی کبھی ملاقات تک نہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مرحوم نے محض "ترجمان القرآن" میں جماعت اسلامی کی دعوت اور

نصب العین پڑھ کر بلا تکلف اس کو قبول کیا اور خود اس کی طرف بڑھنے میں پیش قدمی کی، بغیر اس کے کہ ادھر سے کوئی تحریک کی گئی ہو۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ان کا دل تعصب سے پاک تھا، وہ اپنی رائے میں آزاد تھے، ان کا ضمیر انصاف پسند تھا، اور وہ جس چیز کو حق پاتے تھے اسے پورے خلوص کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ بعد میں تیرہ چودہ سال کے قریبی تعاون کے دوران میں ہر موقع پر ان کے یہ اوصاف عملاً مشاہدے میں آتے رہے۔ اس کے ساتھ ذہنی توازن کا یہ حال تھا کہ جماعت سے گہرا تعلق ہو جانے کے بعد بھی اپنے اُن اکابر سے ان کے ذاتی تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ اُن کی محبت و عقیدت جماعت کے ساتھ ان کی وابستگی میں کبھی خلل انداز ہوئی اور نہ جماعت سے وابستگی نے اُن کے ساتھ شخصی روابط کو کبھی غبار آلود کیا۔

جماعت میں شامل ہوتے ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ جس نصب العین کو اب وہ اختیار کر چکے ہیں وہ ہمہ تن پوری زندگی کا وقف نامہ طلب کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر آگئے اور جماعتی نظام کے تحت انہوں نے "دار العروبہ" قائم کیا جس کا مقصد تحریک اسلامی کے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر کے انڈونیشیا سے مراکو تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا تک پہنچانا تھا۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایسے نوجوان تیار کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی جو صحیح عربی لکھنے پر قادر ہوں تاکہ وہ ان کے کام کو آئندہ جاری رکھ سکیں۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے ایک ایسی جانگسل بیماری کی حالت میں کیا جس نے ان کو گھلا کر صرف ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ بنا ڈالا تھا۔ یہ ان کے عزم اور اخلاصِ نیت اور جذبۂ ایثار و قربانی کا حال تھا۔ وہ ایک چیز کو حق جاننے کے بعد اسے صرف قبول ہی کر کے نہ رہ گئے، بلکہ اس کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے اپنی جان لڑا دی، اس کی خاطر اپنی دنیوی ترقی کے سارے مواقع کو (جو اُن جیسی قابلیت کے آدمی کے لیے کچھ کم درخشاں نہ تھے) قربان کر دیا، اپنا سارا وقت اور سارا سرمایۂ قوت و صلاحیت اسی ایک راہ میں کھپا دیا۔ یہ خوبی جہاں جس انسان میں بھی پائی جاتی ہو، بجائے خود قابلِ قدر ہے۔ خصوصاً ہماری قوم میں تو اس وقت اس صفت کے حامل لوگوں کا قحط ہے۔ اس لیے ان کی قدر و قیمت اس سے بدرجہا زیادہ ہے

جو کسی "مالدار" قوم میں ہو سکتی ہے۔

۵۳ء میں جماعت اسلامی پر جو دورِ ابتلا آیا (بلکہ سچ یہ ہے کہ زبردستی لایا گیا) اُس میں مرحوم کا صبر و ثبات ہم سب کے لیے قابلِ رشک ہے۔ وہ سالہا سال سے دمے کے مریض تھے، ایسے سخت مریض کہ دمے کے دورے کی وہ شدت کبھی ہمارے مشاہدے میں نہیں آئی۔ ان کی صحت تمام تر دوا اور غذا کے خاص اہتمام اور اوقات کی باقاعدگی پر منحصر تھی، اور ان چیزوں میں سے کسی میں بھی فرق آجاتا ان کے لیے پیامِ موت تھا۔ اِس حالت میں حکومت نے یکایک ان کو گرفتار کر کے جیل میں بند کیا اور ان کے مرض کا لحاظ کر کے علاج و غذا کا کوئی خاص انتظام نہ کیا۔ حتیٰ کہ اس مریضِ ناتواں کو جیل میں چارپائی تک نہ دی گئی۔ جو لوگ اس ظلم کے ذمہ دار تھے ان کو قطعاً کوئی احساس نہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے کیسے قیمتی جوہر کو ضائع کر رہے ہیں۔ اور مرحوم کی غیرت یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ اپنے مرض کا حوالہ دے کر کسی ظالم سے رحم کی بھیک مانگیں۔ جو تکلیفیں بھی پیش آئیں کمال درجہ صبر اور تسلیم و رضا کے ساتھ جھیلتے چلے گئے اور اُف تک نہ کی۔ بعید نہیں کہ یہی چیز آخر کار ان کی اچانک وفات کی موجب ہوئی ہو۔ بہرحال چلتے چلتے اُس مردِ مومن نے استقامت کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جو بہت سے اہلِ ایمان کے لیے تقویتِ قلب کا سبب بنا اور انشاء اللہ آئندہ بھی بنے گا۔

تیرہ چودہ سال کی رفاقت میں ہم لوگوں نے ان کو ہمیشہ ایک مخلص دوست، ایک بے لاگ مشیر اور ایک وسیع القلب و وسیع النظر انسان پایا۔ بہت سی باتوں میں دوسروں سے اختلاف رکھنے، اور حسبِ ضرورت اظہارِ اختلاف کرنے کے باوجود وہ اپنی رائے میں کبھی اتنی شدت اختیار نہ کرتے تھے کہ ان کے ساتھ موافقت مشکل ہو جائے۔ رائے میں نہایت آزاد اور اظہارِ رائے میں نہایت بیباک تھے مگر بحث و تمحیص کے بعد جب جماعت کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اسے پوری فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لیتے تھے اور اسے کامیاب کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنی رائے کے خلاف کسی جماعتی فیصلے پر وہ کبیدہ خاطر ہوئے ہوں، یا ان کے گوشۂ قلب میں بھی یہ خواہش چھپی ہوئی پائی گئی ہو کہ وہ فیصلہ ناکام